Fikr-o-Nasar (Islamabad) 39:2 (2001)

فکر و نظر---- اسلام آباد جلد:۳۹ شمارہ:۲

قرآن کریم کے اردو تراجم-تاریخی و ارتقائی مراحل

ڈاکٹر احمد خان ☆

قرآن کریم کو دنیا کے تقریباً ایک تہائی انسانوں تک پہنچانے کا شرف صرف ایک زبان کو حاصل ہے، اور وہ ہے اردو زبان۔ اس لیے اس زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ بے حد اہمیت کا مالک، وقت کی ضرورت اور قرآنی مفہوم و مطالب عام کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔

۲۔ کسی زبان کی اصل تحریر کو دوسری کسی زبان میں منتقل کرنے کو ترجمہ کہا جاتا ہے۔ مگر کسی ایک زبان کی عبارت کو اس کی اپنی لسانی خوبیوں اور معنوی جامعیت کے ساتھ کسی دوسری زبان میں اس کی لسانی خوبیوں اور معنوی جامعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے منتقل کرنا انسانی دسترس سے باہر ہے، لہذا وہ ترجمہ نہیں ہے جس کو ہم ترجمہ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے اپنی سمجھ کے مطابق اس عبارت یا اس تحریر کے مفہوم و مطالب کی ترجمانی کرنا۔ یعنی کسی کتاب یا تحریر کا مفہوم و مطلب دوسری زبان میں ادا کر کے اصل تحریر کے مفاہیم و مطالب کو اس زبان کے جاننے والے کے لیے قابلِ فہم بنا دینا۔ اس لیے دنیا کی کسی کتاب یا تحریر کا جو دوسری زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اس کا مطلب ہوتا ہے۔ اس کتاب کی عبارت کے مفہوم و مطالب کو اپنی بصیرت و علمیت کے مطابق دوسری زبان میں ادا کرنا۔ چنانچہ دنیا کی جتنی تحریریں بھی کسی ایک زبان سے دوسری میں منتقل کی گئی ہیں وہ ترجمہ نہیں ہیں بلکہ ان کی اصل کتاب یا تحریر کے مفہوم کی ترجمانی کی گئی ہے۔

۳۔ جب انسانی تصانیف و تحریرات کا یہ حال ہے کہ ان کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا ہی نہیں جا سکتا تو وحی الٰہی کی زبان کا معاملہ تو اور بھی سنگین ہے۔ اسی لیے ڈبلیو سی سمتھ

☆ مرکز حمایۃ المخطوطات العربیۃ، مکان نمبر ۳۲۳، شہزاد ٹاؤن، اسلام آباد

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

نے بجا کہا ہے کہ: "ہماری بے چارگی و بے بسی کا یہ حال ہے کہ جب ہم انسانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کا دوسری زبان میں دل آویز ترجمہ نہیں کر سکتے، تو خدائی زبان کا ترجمہ کس طرح ہم سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہی کہ اس کا جو مفہوم ہماری سمجھ میں آتا ہو، اس کو ہم اپنی زبان میں بیان کر دیں"۔(۱)

۴۔ غرض کہنے کی یہ ہے کہ قرآن حکیم کا جو بھی کسی زبان میں ترجمہ کہا یا بیان کیا گیا ہے وہ ترجمہ نہیں ہوا اور نہیں ہوتا کیونکہ یہ کسی انسان کی سکت ہی نہیں کہ وہ وحی الٰہی کی لسانی خوبیوں اور معنوی جامعیتوں کو قائم رکھتے ہوئے دوسری زبان میں منتقل کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ اس کی ترجمانی ہو سکتی ہے اور اگر صرف الفاظ کو ان کی اصلی ترتیب کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کیا جائے گا تو اس میں اپنی زبان کا بھی نہ تو حسن و کیف باقی رہے گا اور نہ عبارت میں دلکشی و دلپذیری پیدا ہو سکے گی، بلکہ وہ مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آ سکے گا، جو استفادہ کے لیے ازبس ضروری ہے۔

۵۔ قرآن حکیم ہو یا کوئی اور آسمانی کتاب وحی الٰہی کی زبان کا اسلوب اور اندازِ بیان نرالا ہوتا ہے۔ وحی الٰہی کے الفاظ میں جامعیت اور معنویت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لے ہی نہیں سکتے، چاہے وہ کسی بڑی سے بڑی اعلیٰ درجہ کی فصیح زبان ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری زبانوں کو چھوڑیے عربی زبان تو اتنی وسیع اور جامع ہے کہ کئی چیزوں کے لیے لاتعداد الفاظ موجود ہیں مگر وحی الٰہی کے کسی لفظ کو ہٹا کر عربی زبان کا ہی دوسرا لفظ رکھ دیجئے تو نہ صرف عبارت کا رنگ بگڑ جائے گا بلکہ اس کا جامع و مانع مفہوم و مطلب بھی ضبط ہو جائے گا۔ پھر آپ کسی دوسری زبان میں وحی الٰہی کے کسی جملہ، فقرہ اور آیت کا ترجمہ کرنا چاہیں گے تو یہ ناممکن ہے کہ آپ اس آیت کے لسانی حُسن اور معنوی جامعیت کو دوسری زبان میں منتقل کر سکیں اور اس طرح منتقل کر سکیں کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا اپنا لسانی حسن اور اس کی اپنی معنوی جامعیت بھی برقرار رہے۔

چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی تالیف "کتاب القرطین" میں اہلِ عرب کے مختلف اسالیب بیان کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد فرمایا:

" قرآن کریم کا نزول، ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی

ترجمہ کرنے والا قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں کر ہی نہیں سکتا"[۲] انہوں نے مثال میں متعدد آیات پیش کیں، مثلاً سورہ کہف کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿فضربنا علی آذانهم فی الکهف سنین عددا﴾ [۱۸ : ۱۱]

اور فرمایا: "اگر آپ چاہیں گے اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کر دیں تو اس سے وہ مضمون قطعاً نہیں سمجھا جا سکے گا، جو ان الفاظ میں موجود ہے"۔[۳]

۶۔ ترجمہ و ترجمانی کے سلسلہ میں زبانوں کی کم مائیگی تو آڑے آتی ہی رہی ہے، مگر اس کے علاوہ آسمانی صحیفوں کے ترجمہ کی مخالفت بھی تقریباً ہر ملک و قوم میں کی گئی ہے اور یہ مخالفت بیشتر مرتبہ علمائے دین کی طرف سے ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو علوم دینیہ کا خاص ماہر، بلکہ ان کے پاسبان اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ طبقہ نہیں چاہتا کہ دین کی باتیں عام ہوں۔

علاوہ بریں ترجمے کی مخالفت ان کی طرف سے بریں وجہ بھی ہوئی کہ مترجمین نااہل تھے یا وہ تراجم و تفاسیر اس مخصوص طبقہ کی مرضی و منشاء کے خلاف تھے۔

۷۔ کسی زبان کی تحریر کو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے دو رکاوٹیں عموماً پیش آتے ہیں۔ پہلی یہ کہ شاذ ہی کوئی مترجم ایسا ہو جو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو، اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مترجم کسی ایک زبان پر پورا قادر ہوتا ہے جبکہ دوسری زبان پر اسی قدر قدرت نہیں رکھتا۔ دوسری یہ کہ ترجمہ کرتے وقت مترادفات کی موجودگی مین مترجم کئی مواقع پر ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یا تو اس میں اس کا مزاج کسی طرف جھکاؤ رکھتا ہے، یا اسے ترجمہ کرتے وقت کسی غرض سے خود جھکاؤ رکھنا پڑتا ہے۔

۸۔ یوں تو قرآن کریم کے اردو ترجمہ کی مساعی گوناگوں دقتوں کا شکار رہی ہے۔ مگر عام طور پر جن دقتوں کا خصوصیت سے سامنا کرنا پڑا ہے۔ انہیں تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

☆ ابتدائی دور میں زبان کی کم مائیگی، خصوصاً اسم فاعل و اسم مفعول بنانے کے ہندی قاعدوں کی وجہ سے ترجمہ کرتے وقت بہت سی مشکلات پیش آئیں۔

☆ دوسری دقتیں لفظی ترجمہ کرنے کی وجہ سے پیش آئیں۔ قرآن کریم کے متن سے قریب تر رہنے کی کوشش میں مترجمین کو عربی کی ترکیبِ نحوی کا اتباع کرنا پڑا۔ بدیں سبب اردو عبارات جب عربی عبارات کے ساتھ ساتھ چلیں تو مفہوم کی ادائیگی میں نہ صرف گنجلک پیدا ہوئی بلکہ کئی مقامات پر مفہوم بھی خلط ملط ہوگیا۔

☆ تیسری دقتیں لفظی ترجمہ کی وجہ سے مشکلات سے بچنے کے لیے ضرورت سے زیادہ بامحاورہ ترجمہ کرنے کی بدولت پیدا ہوئیں۔ محاورہ بندی کے اس رجحان سے بھی ترجمہ کو کافی نقصان پہنچا۔ چنانچہ ترجمے کی ایسی محتاط روش جس میں لفظی ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کا حسب ضرورت التزام ہو، کافی دیر میں پیدا ہوئی۔

۹۔ ان کے علاوہ قرآنی مفہوم کو نہ سمجھنے سے جو ترجمہ میں نقائص پیدا ہوئے۔ اس کا تعلق کسی خاص عہد سے نہیں بلکہ یہ نقص ہر عہد میں رہا ہے۔

--- ۲ ---

اردو زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ اردو زبان خود۔ یہ متفقہ امر ہے کہ دسویں صدی ہجری میں اردو کی ابتدائی شکل ظاہر ہوئی جو دراصل وسط ہند میں گجرات (کاٹھیاواڑ) کے قرب و جوار میں عربوں اور مقامی لوگوں کے اختلاط سے معرضِ وجود میں آئی۔ اس زبان کے جملہ کی ساخت ہندی تھی جبکہ اس میں کلمات عربی و فارسی کا تھوڑا بہت دخل تھا۔(۴)

۲۔ اسی ابتدائی زبان میں ہی قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر کا وجود نظر آتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ ابتداء میں قرآن کریم کا ترجمہ جو موجودہ ہیئت میں ہے، وجود میں نہیں آیا بلکہ آیات قرآنی کی تفسیر و ترجمہ پر مشتمل ایک ملی جلی تحریر کی صورت میں شروع ہوا۔ ہم آگے دیکھیں گے کہ اسی لیے ابتدائی عہد میں تفاسیر کا ظہور زیادہ ہے بلکہ ہیں ہی تفاسیر مگر ان میں ظاہر ہے ترجمہ آیات بھی ہے کیونکہ تفسیر انہی آیات کے مفہوم و مطالب کا ترجمہ ہی تو ہوتی ہے۔

یہ ابتدائی تفاسیر سور و آیات کی مختصر تفاسیر تھیں، جن کے اکثر مسودات ناپید ہو چکے ہیں۔ تاہم جو میسر آئے ہیں انہی کی بناء پر اس عہد کے اردو میں تراجم و تفاسیر پر کچھ لکھا جا سکا ہے۔

۳۔ اس سے اگلی صدی یعنی گیارہویں صدی ہجری میں بھی کوئی بہت زیادہ میٹریل میسر نہیں آیا۔ تاہم اس عہد میں معرضِ وجود میں آنے والی تفاسیر و تراجم میں سے ایک معتدبہ حصہ بچ گیا ہے، اس میں سے ایک ''سورہ یوسف'' کی تفسیر ہے۔

قدیم اردو میں قرآن کریم کے تراجم کے سلسلے میں مولوی عبدالحق نے جنوری ۱۹۳۷ء میں ایک طویل مضمون لکھا تھا، جس کی ابتداء میں لکھتے ہیں:

''اس قسم کی سب سے پرانی کتاب جو مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ وہ پرانی گجراتی اردو زبان میں ہے۔ افسوس ہے کہ یہ اوّل و آخر سے ناقص ہے اس لیے مصنف اور سن تالیف کا پتہ چلانا غیر ممکن ہے البتہ زبان کے ڈھنگ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل کی تالیف ہے''۔(۵)

یہ اندازہ مولوی صاحب نے اسی عہد کی ایک دوسری کتاب کی زبان سے تقابل کے بعد لگایا ہے، اور اس قسم کی تحریرات کا اندازہ ایسے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

اس تفسیر میں جگہ جگہ گجراتی لفظ آئے ہیں اس لیے ان پر یہ قیاس کرنا بجا ہے کہ یہ گجراتی اردو میں ہے۔ اس تفسیر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

﴿قال رب السجن أحب إليّ مما يدعونني إليه وإلاّ تصرف عني كيدهنّ أصبُ إليهنّ وأكن من الجاهلين﴾ [سورہ یوسف، الآیۃ ۳۳]

ترجمہ یہ ہے: ''یوسف نے کہیا کہ اے بار خدا ہوں بھاکسی کون دوس دھرتا ہوں اس کام تھیں کر جے کام منجھے اے فرماتی ہے انے اگر توں منجھے انہوں کی مکروں تھیں پنہ منے تراکھے تو ہوں ڈرتا ہوں کہ ہوں بھی انہوں کی بات اوپر خاطر کروں انی سکلے گنہ گاروں منے ہوؤں''۔(۶)

دوسرا نمونہ یوں ہے:

﴿اذهبوا بقميصى هذا فالقوه على وجه أبى يأت بصيرا و أتونى بأهلكم أجمعين﴾ [سورۂ یوسف: ۹۳]

اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''یوسف نے کہیا لے جاؤ میری پیرہنی انے باپ کے

منہ پر چھوڑو تو دیکھتے ہوویں گے انے پچھیں سکلے آپس کے کٹم کوں لیوانے میرے نزدیک آنو"(۷)

اس ترجمہ کی زبان سے اس کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے۔ بہت سے الفاظ و محاورات ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو بعد کے زمانے کی کتابوں میں نہیں ملتے، اس کا اسلوبِ بیان بھی بہت پرانا ہے، جو گجراتی زبان کے قریب بھی ہے۔ اس ترجمے کا مؤلف گجرات (کاٹھیاوار) کے گرد و نواح کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف ہے اور نہ مناسب، عربی صرف و نحو سے قطع نظر قرآنی الفاظ کے لیے ترجمہ کے کلمات بھی موزوں تلاش نہیں کیے گئے۔ اس زبان میں عام بول چال کے علاوہ قدیم مستعمل کلمات کا استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔ اسی طرح اس علاقے سے قریب ایک اور تفسیر کا ٹکڑا ملا ہے جس میں قرآن کریم کے تیسویں جزء کی کچھ سورتوں کی تفسیر اور ترجمہ ہے جو دکنی زبان میں ہے، یہ ٹکڑا بھی اسی زمانے کے لگ بھگ ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس کا بھی اول و آخر ناقص ہونے کے سبب نہ عہد کا تعین ہو سکا ہے اور نہ مصنف کا پتہ چلا ہے، ہاں اس کے عہد کا تخمینہ بالکل سابقہ تفسیر کے ٹکڑے کے انداز پر لگایا گیا ہے۔ اس کی عبارت میں کچھ الفاظ ٹھیٹ دکنی زبان سے ہیں۔ اس ترجمہ کے ہمراہ تفسیر بھی ہے، نمونہ دیکھیں جو سورۃ البینۃ سے ہے:

﴿لم يكن الذين كفروا من أهل الكتاب والمشركين منفكين حتى تأتيهم البينة رسول من الله يتلو عليهم صحفا مطهرة فيها كتب قيمة﴾ [۹۸: ۱-۲]

ترجمہ یوں ہے: "انچی وو لوکان جو کفر کیے کتاب کے لوکاں نے ہور شرک کرنہاریاں نے کنارے ہونہارے نتھے کفرنے تو لگ جو ائی اونوں کوں روشن حجتہ۔ سو بجب ہے خدا نے پڑتا ہے صحیفاں کوں جو پاک ہیں جھوٹ تے۔ اوس میں لکھی تھی نیٹ بات"(۸)

اس ترجمہ میں اردو زبان کی بالکل ابتدائی صورت ہے جس میں ٹھیٹ قدیم دکنی زبان کے کلمات مستعمل ہیں جیسے ﴿كالفراش المبثوث﴾ کا ترجمہ "پتنگ سری کی جھیلی کے" کیا ہے۔ اسی طرح ﴿فمن يعمل مثقال ذرّة﴾ کا ترجمہ "پس جو کوئی کہ عمل کرے گا ذرّے کے

بہار، یعنی لال چمٹی کے بہار یا ذرہ دھلارے کا''۔ دھلارا کے معنی ''گرد و غبار'' ہے۔

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو، قرآن کی اس آیت ﴿إن الذّين كفروا من أهل الكتاب والمشركين في نار جهنم خالدين فيها﴾ [البينة:٦] کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''تحقیق دو لوکان جو کفر کیے اہلِ کتاب نے ہور شرک کرنہاریاں نے (اوس کی عبادت) میں جہنم کی آگ میں اچھیں گے''۔(۹)

۵۔ دکنی زبان میں اس صدی میں سورہ یوسف، سورہ الرحمٰن اور قرآن کریم کے تیسویں پارے کے متعدد ترجمے اور تفسیریں موجود ہیں، جن کی زبان میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ ذیل میں قرآن کریم کے تیسویں جزء کا سابقہ تراجم کی نسبت ایک زیادہ صاف زبان میں نمونہ ہے۔ اس کے مترجم کا بھی علم نہیں ہوسکا۔ اردو زبان کی تدریجی شکل کا ایک اچھا نمونہ ہے، ملاحظہ ہو:

﴿عمّ تيسألون﴾ کسی چیز تے پوچھتے ہیں او کافران یعنی مکی کافران، یعنی بعث تے پوچھتے ہیں آپس میں اے یا رسول کون ہور موماناں کون ﴿عن النبأ العظيم﴾ بزرگ خبر تے ﴿الذی هم فيه مختلفون﴾ ایسی خبر کہ انون اس میں اختلاف کرنہارے ہیں ﴿كلّاسيعلمون﴾ یوں نہیں پونچھتا ہے کہ انکار کریں ترت ہے کہ سمجھیں گے اونوں کوں، یو خدا نے کا وعدہ ہے ﴿ثم كلاّ سيعلمون﴾ پچیں یوں نہیں پونچھتا ہے ترت ہے کہ سمجھیں اونو، دوبارہ لیایا ایسے تاکید کے واستے ہور ثم سوں لیانا سمجھیا کر دیتا ہے۔ یو کہ دوسرا وعدہ بہت سخت ہے۔ بعضے بولے۔ پیلا سو جیو کاڑتے وقت ہو دوسرا سو جزاء کے وقت۔ ﴿ألم نجعل الأرض مهادا﴾ آیا نہیں کیے ہمیں زمین گنوارا جوں نہوا دان کا ہے۔ یو ذکر کرتا ہے تھوڑیاں باتاں کون جو دیکھتے ہیں او خدا کے عجائب صفت تے یو او لوگوں سمجھانے کے واستے اس کی کمال قدرت پر دلیل پکڑیں اس سے بعث کے دوست ہونے پر''۔(۱۰)

زبان و بیان کے اعتبار سے یوں قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں کیا گیا ہے یا پھر بارہویں صدی کے ابتداء میں ہوا ہے۔

۶۔ قرآن کریم کی تفسیر و ترجمہ کا ایک ٹکڑا سورۂ مریم سے آخر قرآن تک کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) میں مخطوط نمبر ۸۶۰ پر موجود ہے، جو پرانی دکنی اردو میں ہے۔ مفسر نے

اس حصہ میں کوئی ایسا اشارہ نہیں کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا تعلق کس علاقہ سے ہے یا کس عہد سے متعلق ہے تاہم زبان و بیان کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفسر دکن سے تعلق رکھتا ہے اور بارہویں صدی ہجری اغلبا ابتدائی، سے متعلق ہے۔ ان صاحب کی تفسیر کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ﴿عم یتسائلون﴾ کیا چیز تے سوال کرتی ہیں کافران تجی ﴿عن النباء العظیم الذی هم فیه مختلفون﴾ یعنی بزرگ خبر کیا ہی وہ کہ قرآن اونو اوس میں اختلاف ﴿کلاً سیعلمون﴾ سوگند ہے جانے کی یو جس چیز میں اختلاف کرتی ہیں سو او ﴿ثم کلاً سیعلمون﴾ بس بیک ہے کہ نیکی یو اپنے بری حقیقت ی کیتیں پچھاں ﴿ألم یجعل الأرض مهادا﴾ آیا نہیں کیا ہوں زمین کیتیں بچھانا ﴿والجبال أوتادا﴾ اور نین کیا ہوں پہاراں میخاں تا زمین استوار اچھی اوس سون ﴿وخلقناکم أزواجا﴾ اور یا نہیں کیا ہوں تمکوں نر اور مادہ تا سند تماری باقی رہینکی یوں۔(۱۱)

یہ ترجمہ لفظی ترجمہ ہے، اس میں تفسیری کلمات کا کہیں کہیں اضافہ کیا گیا ہے، مگر بہت تھوڑا سا۔

۷۔ اس دور میں منظور تراجم بھی ہوئے ہیں، ان میں سے سورہ رحمٰن کی چند آیات کا ایک نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

﴿الرحمٰن، علم القرآن، خلق الانسان علمه البیان﴾

اے لوگو تم کرو بکھان — جن کا میٹھا نام رحمٰن
جن سکھایا ہے قرآن — جن سرجا ہے انسان

﴿الشمس والقمر بحسبان، والنجم والشجر یسجدان﴾

سکھایا تم کو سبھی بیان — چاند سورج سوں حساب پچھان
جھاڑ پیڑ بھی نہیں سجان — سجدہ کریں ہیں اوس کون مان

﴿والسماء رفعها ووضع المیزان، الا تطغوا فی المیزان﴾

اونچا کیتا آن اسمان — راکھے ہے گی ان میزان
اپنے دل سوں حق پچھان — کم زیادہ منہ کر جان(۱۲)

اس ترجمہ میں الجھاؤ نہیں ہے جو نثری ترجمے میں عربی نحوی ترکیب کو زیادہ سے زیادہ قائم رکھنے کے لیے اور متن قرآن سے قریب تر ہونے کی کوشش میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں تو یہ ترجمہ بیان میں بے تکلفی اور روانی کے باعث اس عہد کے آخری حصہ کا نمونہ نظر آتا ہے۔

۸۔ تیرہویں پارے کی تفسیر، جو دکنی زبان اُردو میں ہے، کتب خانۂ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو ۲۱۸ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ ہر صفحے پر بارہ سطریں ہیں۔ اس تفسیر و ترجمہ کے مصنف کا علم ہو سکا ہے اور نہ اس پر سن تالیف درج ہے، البتہ مخطوطات کے فہرس نگار، مولوی نصیر الدین ہاشمی، نے اس تحریر کو بارہویں صدی ہجری کی تالیف قرار دیا ہے۔[۱۳] اول و آخر کسی نشاندہی کا نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے یہ کسی بڑے مجموعہ سے یہ جزء الگ ہوا ہے اس لیے کوئی بعید نہیں کہ یہ مکمل قرآن کی تفسیر ہو، تاہم یقین سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔ ہاں البتہ زبان و بیان سے اس تفسیر کا عہد بارہویں صدی ہجری کا ربع اوّل ہے۔

قرآن کریم کا یہ جزء (الثالث عشر) سورہ یوسف (آیت ۵۳) سے شروع ہوتا ہے اور سورہ الحجر (آیت ۴۸) پر مختتم ہوتا ہے۔ ذیل میں سورہ یوسف کی آیات ۵۳ کا ترجمہ و تفسیر اس عہد کے دکنی اردو میں پیش ہے:

> ”﴿وما ابرّی نفسی﴾ اور نیٖں پاک کرتا ہوں میں نفس کیتیں میرے، یعنی میں کہتا ہوں میں کہ نفس میرا میل اور آرزوؤں سے پاک ہے۔ ﴿ان النفس لأمارة﴾ تحقیق نفس میرا البتہ فرمابردار ہے ﴿بالسوء﴾ سات بدی کے ﴿الاّ ما رحم ربی﴾ مگر جس چیز کیتیں کہ رحم کرے پروردگار میرا، یعنی بخشے اور نفس کے فرمانبردار سے امن میں رکھے۔ ﴿إن ربی غفور رحیم﴾ تحقیق پروردگار میرا غفور بخشنے ہارا ہے گناہ کہ قصد کیتیں، یعنی جو گناہ کہ ظاہر میں نہ آوے اور اس کا خیال دل میں آیا، پروردگار اس گناہ کو بخشتا ہے ﴿رحیم﴾ مہربان ہے کہ بندے کیتیں گناہ سے باز رکھتا ہے۔ جس وقت کہ ایلچی بادشاہ کا بادشاہ کہ رو برو آیا یوسف علیہ السلام کے باتاں تمام کہا، پس بادشاہ کیتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کے آرزو اور زیادہ ہوئے“۔[۱۴]

یہ ترجمہ زیادہ تر لفظی ترجمہ ہے، درمیان میں کہیں کہیں الفاظ کی صراحت زیادہ واضح اور صاف انداز سے کی گئی ہے۔ تفسیر ہونے کے ناطے درمیان میں واقعات اور احوال کو زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی سعی مفسر نے کی ہے۔ زبان کی بناوٹ اور جملوں کی تراکیب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ترجمہ و تفسیر پرانی گجراتی اردو کے مقابلے میں زیادہ سہل اور قابل فہم ہے۔

۹۔ بارہویں صدی ہجری میں ملا حسین علی کاشفی کی تفسیر حسینی کے دکنی زبان میں تراجم ہوئے ہیں، جن میں سے پندرہویں پارے کا ایک ترجمہ کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات میں ''تفسیر سورۂ بنی اسرائیل و کہف'' کے عنوان کے تحت موجود ہے جس کے ۲۶۸ صفحات ہیں۔[۱۵] اس میں کسی مترجم کا نام درج ہے اور نہ ہی ترجمے کا عہد، تاہم اس امر کا تعین ہو چکا ہے کہ یہ تفسیر حسینی کا ترجمہ ہے، کہیں کہیں اسی مفسر کے فارسی کلمات بلکہ تفسیر میں موجود اشعار تک دیئے ہیں، اور کئی مقامات پر ان اشعار کا منظور ترجمہ ہی کر دیا ہے۔ اس ترجمۂ تفسیر کا نمونہ ملاحظہ ہو:[۱۶]

> ''﴿سبحان الذی﴾ پاکی و بے عیبی ہے اوس کی کیتس کہ واسطے کرامت کے ﴿اسری بعبدہ﴾ لے گیا بندہ کیتس اپنے جو محمد ہے ﷺ ﴿لیلا﴾) ایک رات، یعنی بیچ بعضے شب سے ﴿من المسجد الحرام﴾ مسجد حرام سے کہ محیط سات حرم کعبہ کے ہے، یا گھر سے اُم ھانی کے جو دختر ابی طالب کے تھی زوجہ محترمہ رسول اکرم ﷺ کے کس واسطے کہ مکہ اور حریم مکہ، تمام مسجد ہے۔ ﴿الی المسجد الاقصی﴾ طرف مسجد اقصی کے جو بیت المقدس ہے، اور اقصی اوس کیتس اس سبب سے کہتے ہیں کہ دور تر ہے اہل مکہ سے اور بیچ اس زمانے کے سوای اوس کی مسجد دوسری نہ تھی ﴿الذی بارکنا﴾ وہ مسجد کہ برکت کیے ہم ﴿حولہ﴾ اطراف اس کی جو زمین شام ہے ہم برکت دین کے کہ اوس کیتس۔''

تفسیر حسینی کے اصل سے مقابلہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا نسخہ اس تفسیر کا لفظی ترجمہ ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے اس ترجمے کا عہد بارہویں صدی ہجری کا وسط نظر آتا ہے۔

۱۰۔ شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی (ت قبل ۱۱۹۲ھ) نے قرآنِ کریم کے تیسویں جزء کی تفسیر لکھی ہے جس کی تکمیل محرم ۱۱۸۵ھ میں ہوئی۔ اس کا ایک خطی نسخہ ادارہ ادبیات اُردو (حیدر آباد دکن) میں موجود ہے جو ۲۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔(۱۷) یہ تفسیر اپنی تالیف سے کوئی سو سال بعد اس قدر مقبول ہوئی کہ کئی مرتبہ چھپی۔(۱۸)

اس کے دو عنوان عام طور پر مشہور ہوئے، پہلا ''خدائی نعمت''، جو ابجدی نام ہے اور دوسرا ''تفسیر مرادی''۔

اس تفسیر کے بارے میں مولوی عبدالحق بتاتے ہیں کہ ''تفسیر کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے، متروک الفاظ خال خال ہیں اور وہ بھی معمولی جیسے بے (بجائے بہ) وے (بجائے وہ) اوپر (بجائے پر) ہووے (بجائے ہو) اندھیاری (بجائے اندھیرا) جملوں کی ساخت البتہ کسی قدر پرانی ہے''۔(۱۹)

اس ترجمہ وتفسیر کا نمونہ یہ ہے:

﴿عم یتسألون﴾ کیا پوچھتے ہیں یہ لوگ آپس میں **﴿عن النباء العظیم الذی هم فیه مختلفون﴾** اس بڑی خبر سے جس میں وے کئی طرف ہور رہے ہیں **﴿کلا سیعلمون﴾** یوں نہیں اب جان لیں گے **﴿ثم کلا سیعلمون﴾** پھر بھی یونہیں اب جان لیں گے۔ **﴿ألم نجعل الأرض مهادا﴾** کیا ہم نے نہیں بنایا زمین بچھونا **﴿والجبال أوتادا﴾** اور پہاڑیں میخیں **﴿وخلقنا کم أزواجا﴾** اور پیدا کیا ہم نے تم کو جوڑے جوڑے۔(۲۰)

سابقہ تراجم و تفاسیر کے مقابلے میں اس عہد کی زبان کافی صاف سلجھی ہوئی ترقی یافتہ صورت میں معلوم ہوتی ہے۔ قدیم الفاظ یہاں متروک نظر آتے ہیں، البتہ اسم اشارہ میں تبدیلی ابھی واقع نہیں ہوئی ہے۔

اس تفسیر کا عہد شاہ ولی اللہ دہلوی کا عہد ہے، یقیناً اس پر شاہ صاحب کی تحریک کا اثر پڑا ہوگا۔ فکری اعتبار سے یہ قطعۂ تفسیر ولی اللہی تحریک کا حصہ ہی ہے۔

شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں شاہ غلام مرتضیٰ جنون نے تیسویں پارے کی تفسیر و ترجمہ منظوم صورت میں لکھا ہے جس کا سن تکمیل ۱۱۹۴ھ ہے۔ یہ پارۂ تفسیر کوئی ساٹھ سال کے بعد ٹائپ میں چھپ گیا تھا جس کے نسخے کئی کتب خانوں میں ملتے ہیں۔(۲۱)

اندازِ تفسیر کے لیے سورۃ النباء سے نمونہ پیش ہے:

﴿عم یتسالون﴾

اصل میں تھا عم عنما ای پسر — نون کیتیں کرمیم پھر ادغام کر
کر الف کو حذف سن معنے بجان — پوچھیں آ کس چیز سے یہ کافران

﴿عن النباء العظیم الذی ھم فیه مختلفون﴾

اس خبر سے کہ بڑی ہے بے خلاف — کرتے ہیں سب جن میں باہم اختلاف
یا کتاب اللہ ہے بناء عظیم — قول شاعر جس کو کہتے ہیں لئیم
یا کہیں ہیں سحر یا ہے مفترا — نزد بعضے ہے کلام کبریا
یا محمد ہے کہ جمیع مسلمین — اس کیتیں کہتے ہیں ختم المرسلین
اور اسے کہتے تھے ساحر کافران — شاعر و مجنوں گروہ مشرکان
پاک ہے اس نبا سے محشر مراد — اسے نہ آگاہ جز رب العباد

﴿کلا سیعلمون﴾

جانیں گے حقا کہ قوم منکران — روز مرگ و وقت نزع روح جان
یعنی جب ہونگے فرشتے آشکار — تب یقین جانیگے قوم نابکار

﴿ثم کلا سیعلمون﴾

پس یقین جانیگے یہ قوم پلید — جب عذاب قبر ہوئے گا شدید
کہ وقوع بعث میں کچھ شک نہیں — ہم کو جز دوزخ کے اب مسلک نہیں
یا یہ تکرار از پئے تاکید ہے — کہ نہ ان اندھونکو چشم دید ہے
پھر گئے حق نے برائے منکران — یہ دلائل اپنے قدرت کی بیان
کتنے زیر پاہیں کتنے فرق سر — کتنے ان کی ذات میں ہیں جلوہ گر

﴿ألم نجعل الأرض مهادا﴾

آیا یہ ہم نے کیا ہے خاک سے — فرش گسترده تمہارے واسطے
ہے بچھائی ہم نے پانی پر زمین — مردہ اور زندوں کے رہنے کیتیں

﴿والجبال أوتادا﴾

اور کیا کو ہونکو میخین استوار — تا نہ کانپے اور زمیں پکڑے قرار[۲۲]

--- ۳ ---

خطہ پاک و ہند میں بارہویں صدی ہجری کا وسط قرآنِ کریم کے تراجم کے سلسلے میں ایک عظیم الشان عہد کا نقطۂ آغاز ہے۔ شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کی تحریک سے قرآن کریم کی طرف توجہ اور دھیان کو ایک گونہ مہمیز ملی۔ اس امر سے ہر مسلمان واقف ہے کہ ولی اللہی خاندان نے قرآنی علوم کی طرف عوام کو راغب کرنے میں قابل ستائش قدم اٹھائے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے ترجمہ قرآن (تکمیل ۱۱۵۴ھ) سے اس کی تفہیم اور اس کے رموز سمجھنے میں خاطر خواہ پیش رفت ہوئی۔ چنانچہ ترجمۂ قرآن کا یہ نقطہ موڑ تھوڑی سی روشنی ڈالنے کا مقتضی ہے۔

پاک و ہند میں قرآن فہمی کی غرض سے تراجم قرآن کا سلسلہ عرصہ سے ایک ڈگر پر چل رہا تھا۔ مگر شاہ ولی اللہ نے اس سلسلہ میں سابقہ تراجم سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے نقائص کا ادراک کیا، اور حتی الوسع کوشش کی کہ قرآن کریم کا ترجمہ ان جملہ نقائص سے پاک ہو جو سابقہ مترجمین سے سرزد ہوئے ہیں۔ وہ قرآن اور قرآنی علوم کو بے حد سادہ، عوامی اور عام فہم زبان میں عوام تک پہنچانے کے قائل تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کو عام فہم بنانے کے قواعد و ضوابط وضع کیے۔ قرآن کو فہم انسانی کے قریب تر لانے کے لیے ایک جدت کے ساتھ اس کے مفہوم و مطالب کو سہل اور سلیس انداز میں ڈھالنے کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ترجمۂ قرآن یعنی فتح الرحمٰن کے دیباچہ میں اس کا یوں اظہار کرتے ہیں۔[۲۳]

> ''موجودہ زمانہ جس میں ہم رہ رہے ہیں اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضا ہے قرآن کریم کا ترجمہ (فارسی میں) ایسا سلیس سادہ اور عام فہم ہونا چاہیئے جو بلا تکلف سمجھا جا سکے، اس میں اپنی بڑائی، تصنع اور عبارت آرائی کا شائبہ تک نہ ہو''۔

شاہ صاحب نے سابقہ مترجمین کے کام کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا تو ان مترجمین کو درج ذیل گروہوں میں بٹا ہوا پایا:

۱۔ پہلا گروہ ہر لفظ کا ترجمہ جدا جدا کرتا جاتا ہے اور آخر مضمون تک اسی روش کا پابند رہتا ہے۔ اس طریق ترجمہ کو ''لفظی ترجمہ'' کا نام دیا گیا ہے۔[۲۴]

۲۔ دوسرا گروہ پورے کلام میں غور و تامل سے کام لیتا ہے، مجاز و کنایہ، عبارات میں تقدیم و تاخیر اور دیگر رعایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عبارت کے مفہوم کو ذہن نشین کرتا ہے۔ بعد ازاں اپنی سمجھ کے مطابق قرآنی کلمات کے معانی کے لیے موزوں و مناسب الفاظ و تراکیب کی بندش کر کے قرآن کا ترجمہ کرتا ہے۔ اس ترجمہ کو شاہ ولی اللہ ترجمہ ''بیان حاصل معنی'' قرار دیتے ہیں۔(۲۵)

شاہ صاحب نے ان دونوں طریق ترجمہ کو نقائص و خلل سے مبرا قرار نہیں دیا۔ اور پھر اس ضمن میں اپنا نقطۂ نظر باقاعدہ مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔

۳۔ پھر ایک جماعت نے ان دونوں راہوں سے جدا ایک تیسری راہ اپنائی۔ چنانچہ انہوں نے ''لفظی'' اور ''بیان حاصل معنی'' کو اکٹھا کرنے کی سعی کی۔ اپنے ابتدائی دورِ ترجمۂ قرآن میں شاہ صاحب بھی اس انداز کے حامل تھے، مگر بعد میں اس طریق ترجمہ کے عیوب بھی شاہ صاحب پر عیاں ہونے لگے تو اسے بھی معیوب گردانا۔

۴۔ چنانچہ ایک چوتھی راہ تلاش کی جس میں مذکورہ بالا ہر سہ طرق کے فوائد جمع کیے، ان میں جو جو نقائص تھے انہیں دور کیاے اور تھوڑی تھوڑی عبارت پر مشتمل ترجمہ کرنے کے حامی بن گئے۔ اس طریق کار کی وضاحت مختصراً یوں کرتے ہیں۔(۲۶)

''ترجمۂ تحت اللفظ را بیک دست گرفت، و خللہا را یاد داشت، و تصرف درفنون آن منظور نظر نمود، و بیان حاصل معنی را بدست دیگر گرفت، و مواضع صعوبہ فہم مراد و طریق مخلص از آنہا بسہولت ادا ضبط کرد''۔

انہی اصول و قواعد کی روشنی میں شاہ ولی اللہ نے اس وقت کی سرکاری زبان (فارسی) میں قرآن کریم کا ترجمہ کی ابتداء کی اور ایک گروہ کی شدید مخالفت کے باوجود اس ترجمہ کو عام کرنے کے لیے باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ دلی میں شروع کر دیا۔(۲۷) شاہ صاحب کا موجودہ فارسی ترجمہ اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ترجمۂ قرآن کو حسن و خوبی کے ساتھ کرنے، قرآنی مطالب کو عام فہم کی سطح تک لاکر عوام کے سامنے پیش کرنے کی جو شاہ صاحب نے طرح ڈالی تھی، اس سے شاہ صاحب کے فرزندان نے کماحقہ نہ صرف استفادہ کیا بلکہ قرآن کے مطالب کو عین عوامی زبان یعنی

اردو میں بے حد آسان، سہل اور رواں زبان میں ترجمہ کر کے قرآن کریم کو خواص کی سطح سے بہت نیچے لے جا کر عوامی سطح تک لے آئے۔

میرے خیال میں شاہ ولی اللہ کے تیسرے فرزند شاہ عبدالقادر (۱۱۶۷ھ-۱۲۳۰ھ) نے قرآن کے معانی کو متعارف ھندی (یعنی اردو) میں ڈھالنے کا ڈول ڈالا۔ اپنے والد محترم سے تعلیم و تربیت کے بعد دلی کی اکبر آبادی مسجد کے حجرے میں ترجمہ قرآن کی تعلیم شروع کی۔ ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"کلام پاک کا عربی زبان ہے اور ہندوستانی کو اس کا ادراک محال۔ اس واسطے اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ ابن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں۔ سہل اور آسان، اب ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے۔ الحمد للہ سن بارہ سو پانچ میں میسر آیا"۔(۲۸)

ترجمہ میں شاہ عبدالقادر کی روش اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ منصوبہ بند طریقے پر مطلب خیز ترجمہ کرتے ہیں لیکن متن قرآن کے لفظ لفظ کو اپنی گرفت میں لے کر چلتے ہیں۔ ترجمہ کی زبان نہایت آسان، سہل اور رواں ہوتی ہے۔ لفظ لفظ کے معنی و مفہوم اور آیتوں کے مضامین کی صحت و استواری کو بنیادی طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ جا بجا عوام کو سوجھ بوجھ کی حد تک ضروری باتیں اور دلنشیں نکتے برمحل فوائد کی شکل میں ویسی ہی عام فہم اور نکھری ستھری زبان میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں محاورہ بے تکلف کھپ سکتا ہے کھپا دیتے ہیں ورنہ اپنی زبان دانی کا رعب نہیں ڈالتے۔ ان کے پیشِ نظر عربی و فارسی زبان و ادب سے بالکل کورے عوام تک ان کی سمجھی بوجھی زبان میں قرآن کے صحیح و مفید ترین مفہوم کا ادا کر دینا بنیادی مقصود کی حیثیت سے رہتا ہے کہ اس ترجمہ کو پڑھ کر عوام کا ذہن ہموار ہو کر قرآن کریم کی بیناتی تعلیم کو جذب کرتا چلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد تک اردو زبان کے دو روپ جو ریختہ اور ہندی کے ناموں سے ایک خاص عبوری مرحلہ تک پہنچ چکے تھے، ان میں سے ریختہ کی بجائے ہندی یا ہندوستانی کو جس میں عربی و فارسی کی آمیزش بقدر نمک ہوتی ہے، ترجمہ و فوائد کے لیے اختیار کیا۔ قرآنی مفہوم و مطالب کی عمدگی کے

ساتھ ادائیگی کے لیے خالص ہندی اور سنسکرت کے الفاظ لانے کے لیے دریغ نہیں کرتے۔

شاہ صاحب نے قرآن کریم کے اردو بامحاورہ ترجمہ میں اختصار کے باوجود کلامِ خداوندی کی لفظی فصاحت و بلاغت اور معنوی نکات و لطائف کا نہایت حکیمانہ انداز سے اظہار کیا ہے، اور اپنے وقت کی عوامی زبان سے ہندی، پراکرت اور سنسکرت کے اچھے سے اچھے الفاظ چن چن کر قرآن کریم کو بے حد عمدگی کے ساتھ عوام الناس کے ذہنوں میں اتارنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

اس ترجمہ کے بارے میں مولوی عبدالحق کی رائے بہت وقیع ہے، وہ فرماتے ہیں:

"شاہ عبدالقادر کا ترجمہ بہت مقبول اور مشہور ہوا اور ابھی تک بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ٹھیٹ اردو میں ہے۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کے لیے ہندی یا اردو کے ایسے برجستہ اور برمحل الفاظ ڈھونڈ نکالے ہیں کہ ان سے بہتر ملنا ممکن نہیں"۔(۲۹)

۳۔ شاہ عبدالقادر کے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ) نے اپنے والد بزرگوار سے بہت کچھ سیکھا، قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کا جذبہ ان کے دل میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے جو مذکورہ بالا ان کے بھائی کے ترجمہ قرآن سے بالکل الگ نہج پر ہے۔ یہ ترجمہ اگرچہ ایک ضرورت کے تحت وجود میں آیا، مگر لفظی ترجمہ ہونے کے ناطے کافی مقبول ہوا۔ ہوا یہ کہ سیّد نجف علی خان فوجدار کو قرآن کریم کا تحت اللفظ ترجمہ سبقاً سبقاً پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ شاہ رفیع الدین سے درخواست کی، آپ نے منظور فرمایا۔ نجف علی ترجمہ کو سن کر قلمبند کرتے جاتے تھے۔ تمام ہونے پر وہ قلمبند شدہ نسخہ شاہ رفیع الدین کو دکھایا۔ شاہ صاحب نے شروع سے آخر تک اس پر نگاہ ڈالی، اور اس کی توثیق کر دی۔ بعد میں نجف علی خان کے بیٹے سید عبدالرزاق نے یہی ترجمہ اپنے مطبع سے ۱۲۷۲ھ میں شائع کر دیا۔(۳۰)

ان دونوں حضرات کے تراجم کے بارے میں مولوی عبدالحق کی رائے یہ ہے کہ:

"یوں تو دونوں ترجمے لفظی ہیں لیکن شاہ رفیع الدین نے ترجمے میں عربی جملے کی ترکیب اور ساخت کی بہت زیادہ پابندی کی ہے۔ ایک حرف ادھر سے ادھر

نہیں ہونے پایا۔ ہر عربی لفظ بلکہ ہر حرف کا ترجمہ خواہ اردو زبان کے محاورے میں کھپے یا نہ کھپے انہیں کرنا ضروری ہے۔

شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں اس قدر لفظی پابندی نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور اصل لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اردو زبان کے روز مرہ اور محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسری خوبی ان کے ترجمے میں ایجاز کی ہے یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں پورا مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہو جائے۔(۳۱)

بطور نمونہ ان دونوں حضرات کے تراجم دیئے جاتے ہیں تاکہ قاری کو ان دونوں ترجموں میں فرق جاننے میں آسانی ہو۔

قرآن کریم	شاہ رفیع الدین	شاہ عبدالقادر
﴿بسم الله الرحمن الرحیم﴾	شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے بخشش کرنے والے مہربان	شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا
﴿الٓمّ، ذلك الكتاب لاريب فيه هدى للمتقين﴾	یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے، راہ دکھاتی ہے واسطے پرہیزگاروں کے	اس کتاب میں کچھ شک نہیں، راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو
﴿الذين يؤمنون بالغيب و يقيمون الصلوٰة ومما رزقناهم ينفقون﴾	وہ لوگ کہ ایمان لائے ساتھ غیب کے (یعنی بن دیکھے) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور اس چیز سے کہ دیا ہے ہم نے ان کو خرچ کرتے ہیں۔	وہ یقین کرتے ہیں بن دیکھا اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔
﴿والذين يومنون بما انزل اليك وما أنزل من قبلك و بالآخرة هم يوقنون﴾	اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ساتھ اس چیز کے جو اتاری گئی ہے طرف تیری اور جو اتاری گئی ہے، پہلے تجھ سے اور ساتھ آخرت کے وے یقین رکھتے ہیں۔	اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اترا تجھ پر اور جو تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں۔

﴿أولئك علی هدی من ربهم و أولئك هم المفلحون﴾ یہ لوگ اوپر ہدایت کے ہیں انہوں نے پائی ہے راہ اپنے پروردگار اپنے سے اور یہ لوگ رب کی اور وہی مراد کو پہنچے۔ وہی ہیں چھٹکارا پانے والے

ان دونوں ترجموں کے باہم مقابلے سے مولوی عبدالحق نے شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی فوقیت یوں ظاہر کی ہے:

''اوّل تو اس میں ایجاز ہے یعنی بلاوجہ کوئی لفظ اپنی طرف سے داخل نہیں کیا۔ دوسرے اردو روزمرہ اور جملوں کی ساخت کا خیال رکھا ہے۔ تیسرے ترجمہ ریختے میں نہیں بلکہ ہندی متعارف یعنی ہندوستانی میں کیا ہے۔

ان وجوہ سے ترجمہ زیادہ سلیس اور صحیح ہے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ زیادہ صحیح اور اصل سے قریب تر ہے اور اس سے اصل مفہوم بہتر طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ رہی جملوں کی ترکیب سو دونوں ترجمے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے اس کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ اپنے بھائی کے ترجمے کے مقابلے میں اس قدر بہتر اور افضل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ہوتے ہوئے چند سال بعد دوسرے ترجمے کی ضرورت کیوں سمجھی گئی۔(۳۲)

۴۔ ۱۲۱۴ھ کے آخر میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس کے اولیں پرنسپل گلکرائسٹ تھے جس میں مختلف مضامین کی تعلیم کے ساتھ ایک دار الترجمہ قائم کیا گیا اس میں مختلف زبانوں کے لیے مترجمین رکھے گئے جن میں زیادہ تر مقامی لوگ کافی اہل ثابت ہوئے۔ اسی دارالترجمہ کے ذمہ گلکرائسٹ نے قرآن کریم کا ہندی/ہندوستانی/ریختہ میں ترجمہ کا اہتمام کیا۔ سب سے پہلے مولوی امانت اللہ اور مولوی فضل اللہ کو قرآن کریم کے ترجمہ کا کام سپرد ہوا، جبکہ اردو زبان کی درستگی اور محاورہ درست رکھنے کا کام میر بہادر علی حسینی اور کاظم علی جوان کرتے رہے۔ پانچ پاروں کے بعد ترجمے میں لفظی نزاع کی بناء پر مولوی امانت اللہ الگ ہوگئے اور مولوی فضل اللہ کا ساتھ حافظ غوث علی نے شروع کر دیا، تاآنکہ اکیس پاروں تک ترجمہ مکمل ہوگیا۔ پھر حافظ غوث علی بھی الگ ہوگئے جبکہ کاظم علی جوان نے شروع سے لے کر آخر تک اردو محاورے کی نگرانی کا کام کیا، ان کے ہمراہ میر بہادر علی حسینی بائیس پاروں تک شریکِ کار رہے۔(۳۳)

خاتمہ کے کلمات کاظم علی جوان کے قلم سے ہیں جن میں ترجمہ کرنے کے احوال اور جن جن حضرات نے یہ ترجمہ کیا ہے، ان کے ذکر کے ساتھ دیگر معلومات بھی دی گئی ہیں۔

اس ترجمۂ قرآن سے سورۂ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیات کا ترجمہ بطور نمونہ پیش ہے:

"یہ وہ کتاب ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں۔ راہ دکھانے والی ان پرہیزگاروں کی ہے جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز کیا کرتے ہیں، اور جو کچھ کہ ہم نے روزی ان کو دی اس میں سے خیرات کرتے ہیں، اور جو کہ ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو تجھے بھیجی گئی اور اس پر جو تجھ سے آگے نازل کی گئی، اور قیامت پر وے ہی یقین لاتے ہیں۔ وے اپنے پروردگار کے فضل سے سیدھی راہ پر ہیں اور وے ہی مطلب کو پہونچیں گے"۔ (۳۴)

اس ترجمے کے بارے میں مولوی عبدالحق کی درج ذیل رائے کافی وقیع ہے:

"جہاں تک اردو زبان کی ساخت اور ترکیب کا تعلق ہے یہ ترجمہ پہلے تمام ترجموں کے مقابلے میں زیادہ بامحاورہ اور سلیس ہے۔ اگرچہ الفاظ کی رعایت مدنظر رکھی ہے کیونکہ ایسے صحیفوں کے ترجمے میں اس کے بغیر چارہ نہیں تاہم حتی الامکان اردو کے روزمرہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور جملے کی ترکیب عربی نہج پر نہیں بلکہ اردو ڈھنگ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ بغیر کسی دقت کے صاف صاف سمجھ میں آتا ہے"۔

یہ ترجمہ اگرچہ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجموں سے تقریباً چودہ پندرہ سال بعد کا ہے، مگر پھر بھی ان ترجموں کے مقابلے میں ہیچ ہے، کیونکہ وہ دونوں ترجمے قرآن کریم کے مطالب سے زیادہ قریب ہیں۔ فورٹ ولیم والے ترجمے میں اگرچہ ریختہ اور ہندی دونوں کا مجموعہ کیا گیا ہے، مگر ایک مشترک کوشش ہونے کے سبب اور یک فردی سوچ نہ ہونے کی بدولت ان دونوں ترجموں کے پایہ تک نہیں پہنچ سکا ہے۔

۵۔ اسی عہد میں حکیم محمد شریف (متوفی ۱۲۲۲ھ یا ۱۲۳۱ھ) جو دلی کے معروف و نامی گرامی طبیب تھے، انہوں نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکا مگر اپنے عہد کا ایک بہتر نمونہ ہے۔ مولوی عبدالحق

نے یہ ترجمہ حکیم احمد خان کے کتب خانے میں ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ دیکھا تھا۔ مولوی صاحب نے ان کی طرف سے سورہ فاتحہ کے ترجمے کا یہ نمونہ پیش کیا ہے۔

"جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے پالنے والا ہے۔ تمام کو بخشنے والا وجود کا آخرت میں، مہربان داخل کرنے بہشت کے سے، مالک دن قیامت کے کا، تصرف کرنے والا اوس دن جو چاہے گا کرے گا۔ خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں، اوپر بندگی تری کے۔ دیکھا تو ہم کو راہ سیدھی بیچ قول کے اور فعل کے اور اخلاق کے۔ راہ اون آدمیوں کی--- اور نہ راہ گمراہوں کی"۔ (۳۵)

حکیم صاحب کی زبان کافی صاف اور موجودہ اردو کے قریب تر ہے۔ لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی مگر اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ ہندی میں نہیں بلکہ ریختہ میں ترجمہ ہے۔ حکیم صاحب کی زبان علماء کے نزدیک شاہ عبدالقادر کی زبان سے زیادہ صاف اور سریع الفہم ہے۔ (۳۶)

۶۔ قدیم اردو میں قلت تالیف کی بناء پر ہم نے قرآن کریم کے اجزاء کی تفسیر و ترجمہ کو بھی زیر بحث رکھا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تب مکمل قرآن کریم کے تراجم کی طرف دھیان بھی کم تھا، اور علماء اس کی ہمت نہیں پاتے تھے، سوائے اکا دکا ترجمہ قرآن کے اس عرصہ میں مکمل قرآن کے تراجم نہیں ملتے۔ البتہ ولی اللہی خاندان کے ترجموں کے بعد پورے پورے قرآن کے ترجمے ہونے شروع ہوگئے تھے۔

یہ عہد (۱۲۰۰ھ تا ۱۳۰۰ھ) قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر کے ضمن میں بافراط میٹریل رکھتا ہے۔ اس عرصہ میں قرآن کریم کے کئی مکمل تراجم ہیں اور کچھ اجزاء و سورتوں پر مشتمل ہیں۔ مگر ہم صرف اہم تراجم و تفاسیر کا ذکر کریں گے۔

۷۔ ان میں سے دکنی زبان کی معروف تفسیر وہابی ہے، مکمل قرآن کریم کے اس ترجمہ و تفسیر کے مصنف عبدالصمد بن عبدالوہاب خان شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس تفسیر و ترجمہ کا زمانہ تالیف ۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ ہے جبکہ مصنف کا انتقال ۱۲۷۰ھ سے قبل ہوا ہے۔ اس ترجمہ و تفسیر کی زبان تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں جو زبان مروج تھی اس

کے مطابق ہے، سورۃ فاتحہ کا نمونہ دیکھیں:(۳۷)

﴿الحمد لله﴾ اول میں آخر تک تمام تعریف سزاوار ہے اللہ تعالیٰ کیتئیں۔ ﴿رب العالمین﴾ اور ایسا کہ پالنی ہارا ہے تمام عالم کا ﴿الرحمن الرحیم﴾ بخشن ہارا قیامت میں مسلمانوں کو اور نہیں بخشن ہارا کافرونکو ﴿مالک یوم الدین﴾ صاحب ہے روز قیامت کا ﴿إیاک نعبد﴾ خاص تجکو عبادت کرتے ہیں ہم ﴿وإیاک نستعین﴾ اور خاص تیرے سے مدد چاہتے ہیں ہم۔ ﴿اهدناالصراط المستقیم﴾ نیک راہ بتا تو ہمارے تئیں۔ ﴿صراط الذین أنعمت علیهم﴾ ایسی راہ ہے کہ جو چلے ہیں اوس راہ سیں نعمت دیا ہے اون کے تئیں، یعنی پیغمبروں کو ﴿غیر المغضوب علیهم﴾ جن لوگوں پر کہ تو نے غضب کیا ہے ہم کو ویسی راہ مت بتا، یعنی یہود و نصاری کی راہ ﴿ولا الضالین﴾ اور جو لوگ کہ گمراہ ہوئے ویسی راہ ہم کو مت بتا۔ ﴿آمین﴾. یہ دعا ہماری تو قبول کر۔ (۳۸)

دکنی زبان میں قرآن کریم کے تراجم میں یہ زبان کافی صاف ہے اور بقول مولوی عبدالحق اس کی زبان ویسی ہی ہے جیسی جنوبی ہند میں آج کل (۱۹۳۷ء میں) مروج ہے۔ قدیم الفاظ خال خال ہیں۔

اس تفسیر کا ایک قلمی نسخۂ کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں مخطوط نمبر ۵۲۸ پر رکھا ہے، جس کے ۲۶۳۲ صفحات ہیں۔(۳۹)

۸۔ اس عرصہ یعنی تیرہویں صدی ہجری کے وسط سے آخر تک کئی منظوم ترجمے و تفاسیر بھی اردو زبان میں لکھے گئے۔ ان میں قاضی عبدالسلام بدایونی (متوفی ۱۲۸۹ھ) کی ''زاد الآخرۃ'' بہت مشہور ہے۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ پہلے آیت لکھتے ہیں اور اس کے نیچے ترجمہ وتفسیر منظوم دیتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ یوسف کی تفسیر و ترجمہ حکیم محمد اشرف نے منظوم لکھا اور انداز کار یہ ہے کہ پہلے آیت پھر نثر میں ترجمہ اور اس کے منظوم تفسیر ہے۔ یہ تفسیر بمبئی سے ۱۲۶۴ھ میں طبع ہوئی۔ اس مختصر تفسیر کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ اور دوسرا نسخہ کتب خانہ ادبیات اردو، حیدر آباد دکن میں موجود ہیں۔

منظوم تراجم و تفاسیر میں کتب خانہ سالار جنگ (حیدر آباد دکن) میں مخطوطہ نمبر ۱۰ پر موجود سورہ یسین کی منظوم شرح لائق توجہ ہے۔ اس کی زبان کافی حد تک صاف اور واضح ہے، ملاحظہ ہو۔(۴۰)

﴿یٰس، والقرآن الحکیم﴾

یعنی سن اے سید جملہ امم ہم کو اس قرآن محکم کی قسم
یا کہ ہے حاکم بحق یا ہے حکیم یعنی پُرحکمت ہے قرآن عظیم

﴿إنک لمن المرسلین﴾

ہے تو تحقیق اے محمد نامہ بر اون رسولوں سے کہ آئے پیشتر

﴿علی صراط مستقیم﴾

برطریق راست و براہ درست وہ رہِ توحید ہے رہو اس پر چُست
یا کہ تو بھیجا گیا ہے ای کریم برطریق استقامت رہو مستقیم

زبان و بیان کے نقطۂ نظر سے مفسر کی کوشش کافی حد تک کامیاب ہے، جو تیرہویں صدی ہجری کے اواخر کا عمدہ نمونہ ہے۔

۹۔ اس عہد میں چند اور تراجم القرآن لکھے گئے مگر انہیں زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی، ان میں سے دو ترجمے جو ۱۲۸۵ھ میں کیے گئے، ان کے قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔ ان میں ایک ترجمہ محمد ہاشم علی نامی کی قلم سے ہے۔ اسی طرح ظہور الدین بلگرامی کا ترجمہ جو ۱۲۹۰ھ میں مکمل ہوا تھا، برٹش میوزیم ہی میں ہے۔[۴۱]

علاوہ بریں سن ۱۳۰۰ھ میں کیا گیا ایک ترجمۂ قرآن سنٹرل اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے، جس کے مترجم کا علم نہیں ہوسکا۔ ۱۳۰۲ھ میں حسین علی خان نے اردو میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، جس کا نسخہ کتب خانہ فیلسوف جنگ حیدر آباد دکن میں موجود تھا۔ غرض ایسے اور بھی کئی ترجمے ہیں مگر انہیں شہرت مل سکی اور نہ اتنی اہمیت رکھتے تھے۔

--- ۴ ---

تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں ایک ایسا ترجمہ ہوا ہے جس نے قرآن کریم کے اردو تراجم کے ایک جدید عہد کی بناء ڈالی ہے۔ سادہ، سلیس، آسان اور قابل فہم زبان میں سرسید احمد خان (۱۲۳۲ھ-۱۳۱۵ھ) نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ میں افکار و خیالات کی غلطیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ سرمایۂ اردو میں ایک نئی طرح ڈال دی گئی۔

سادہ نثرنگاری کا رجحان فورٹ ولیم کالج سے شروع ہو چکا تھا، اس انداز تحریر کو سرسید

کی مذہبی، علمی، قومی اور سیاسی موضوعات پر سادہ نثر میں بے شمار تحریروں نے اردو میں ہر موضوع پر اظہار خیال کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ سرسید ایک تحریک تھے، انہوں نے اپنے زورِ قلم سے نہ صرف اردو کو سرمایہ زبان مہیا کیا بلکہ اس سادہ تحریر میں اشہب قلم دوڑانے والا قافلہ تیار کر لیا جس میں حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک اور مولوی چراغ علی جیسے کتنے ہی بلند پایہ اہل قلم تھے۔ محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد دہلوی اور مولوی ذکاء اللہ کا اگرچہ سرسید سے براہ راست تعلق نہ تھا مگر زمانے کی نئی ہوا نے انہیں بھی سادہ زبان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

اس عرصہ میں عیسائیت سے ٹکر کے سبب مذہبی موضوعات کی طرف ایک حد تک زیادہ توجہ رہی، اور ان موضوعات کے لیے تحریرات کا ذریعہ اردو زبان ہی بنی۔

سرسید احمد خان کا قرآن کریم سے بہت گہرا لگاؤ تھا، قرآن فہمی کی غرض سے سرسید نے بے شمار موضوعات پر اردو میں خامہ فرسائی کی۔ اس نے قرآن کریم کی تفسیر میں عقلی دلائل کا زیادہ سہارا لیا جس کی وجہ سے وہ کئی مقامات پر ٹھوکریں کھا گئے۔

ان کی تفسیر کئی جلدوں میں کئی مرتبہ چھپی، ہم ذیل میں ان کے ترجمہ کا نمونہ دے رہے ہیں جو سورہ فاتحہ کا ہے:

> ''خدا کے نام سے بڑا رحم والا ہے بڑا مہربان۔ سب بڑائیاں خدا ہی کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان اور بڑا رحم والا۔ حاکم ہے انصاف کے دن کا۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھی راہ پر چلا۔ ان لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے بخشش کی۔ نہ ان کی راہ پر جن پر تیرا غصہ ہوا اور نہ بھٹکنے والوں کی راہ''(۴۲)

انتہائی سادہ، آسان و صاف زبان میں ترجمے کی سرسید نے روش اختیار کی۔ جس کے بعد اسی انداز سے ترجمے ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔

۲۔ مولوی ابو محمد عبدالحق (۱۳۰۵ھ) دہلوی کی تفسیر مع ترجمہ جو ۱۳۰۵ھ سے لے کر ۱۳۱۸ھ تک تالیف ہوئی، کا انداز دیگر ایسی تفاسیر سے اور خاص طور پر سرسید کی تفسیر سے بالکل جدا تھا۔ اس میں ترکیب نحوی، حل لغات، ربط آیات اور شانِ نزول وغیرہ سے متعلق

بہت سی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ زبان بے حد سادہ اور شستہ ہے۔ مولوی عبدالحق دہلوی اسلوبِ بیان اور زبان کی سادگی کی بدولت سرسید احمد خان سے سبقت لے گئے ہیں۔

ان کے ترجمہ کا نمونہ سورہ فاتحہ کے ضمن میں پیش ہے:

﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾ شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحمت کرنے والا ہے۔ ﴿الحمد لله رب العالمين﴾ سب طرح کی خوبیاں اللہ کے لیے ہیں جو کل مخلوقات کا پرورش کرنے والا ہے۔ ﴿الرحمن الرحيم﴾ جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا۔ ﴿مالك يوم الدين﴾ جزاء کے دن کا مالک۔ ﴿إياك نعبد و إياك نستعين﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہر کام میں مدد مانگتے ہیں۔ ﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ ﴿صراط الدين أنعمت عليهم﴾ ان لوگوں کے راستہ پر چلا کہ جن پر تو نے بخشش کی (انبیاء)۔ ﴿غير المغضوب عليهم﴾ نہ ان لوگوں کی راہ جن پر تو خفا ہوا۔ ﴿ولا الضالين﴾ اور نہ ان کی راہ پر کہ جو گمراہ ہیں (کفار و مشرکین)۔ (۴۳)

مولوی ابو محمد نے سادہ، سلیس اور رواں زبان میں ترجمہ کیا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔

۳۔ چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں ایک بے حد اہم، قابل قدر اور بے نظیر ترجمہ اردو زبان کو میسر آیا جس کے مترجم مولوی ڈپٹی نذیر احمد (۱۲۴۷ھ-۱۳۳۰ھ) تھے۔ مرحوم نے یہ ترجمہ چند سالوں میں مکمل کیا اور ۱۳۱۷ھ میں زیور طباعت سے آراستہ کرایا۔ ڈپٹی صاحب زبان و ادب عربی کے عناصر خمسہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے ترجمہ قرآن کے بارے میں اردو کے عظیم ادیب افادی مہدی نے کہا تھا کہ ''بے شک یہ ترجمۂ قرآن ایک مہتم بالشان کوشش ہے جس کے لیے آئندہ نسلیں بھی ان کی ممنون ہوں گی''۔

مولوی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کی زبان بے حد سادہ اور بامحاورہ ہے۔ عربی دانی کی بناء پر قرآن فہمی اور اس کے مطالب و مفہوم کو بے تکان عمدہ اور اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔

ان کے ترجمہ قرآن کا نمونہ سورہ بقرہ کی آخری آیت سے لیا گیا ہے۔

﴿ربنا لا تؤاخذنا إن نسينا أو أخطانا﴾ اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا

چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال میں نہ پکڑ۔ ﴿ربنا ولا تحمل علینا إصراً کما حملته علی الذین من قبلنا﴾ اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں جس طرح ان پر تو نے (ان گناہوں کی پاداش میں احکام سخت کا) بار ڈالا تھا ویسا ہم پر نہ ڈال۔ ﴿ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به﴾ اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس (کے اٹھانے) کی ہم کو طاقت نہیں، ہم سے نہ اٹھوا۔ ﴿واعف عنا واغفرلنا وارحمنا﴾ اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر اور ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما۔ ﴿أنت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین﴾ تو ہی ہمارا (حامی و) مددگار ہے۔ تو ان لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں ہماری مدد کر۔[۴۴]

مولوی نذیر احمد دہلوی کے ترجمہ قرآن کی ممتاز خصوصیت اس کی بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے اور ان کا کمال یہ ہے کہ ترجمہ میں روانی کی خاطر بین القوسین ایسے کلمات لائے ہیں جو قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے کے لیے بے حد آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسے کلمات کے در آنے سے قرآنی مفہوم کو اپنے مقاصد کے مطابق ترجمانی کرنے میں کئی مقامات پر مولوی صاحب سے چوک ہوئی جس کے بارے میں کافی لوگوں نے ان پر جرح کی ہے،[۴۵] تاہم زبان کی سلاست و روانی بے حد قابل تعریف ہے۔

۴۔ مولوی اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ بہت سی تصانیف ان کے قلم سے نکلی ہیں جو سبھی دینی معلومات پر مشتمل ہیں۔ تفہیم کا انداز بے حد جاذب ہے۔ سادہ اور محاورہ زبان میں ما فی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا ترجمہ ''ترجمہ القرآن'' کے نام سے پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۹۰۸ء میں چھپا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۱۴ء میں ''ترجمہ اشرفیہ نوریہ'' کے نام سے محبوب المطابع دہلی سے شائع ہوا۔

انہوں نے ترجمہ بین السطور لکھا جس کی زبان بے حد آسان اور عام فہم ہے۔ توضیحی کلمات سے آیات کا مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ ''یہ ترجمہ بامحاورہ اور مطلب خیز ہے، باقی ترجموں سے بے نیاز کر دینے والا ہے۔[۴۶]

بطور نمونہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

﴿بسم الله الرحمن الرحیم﴾ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان

نہایت رحم والے ہیں۔ ﴿الحمدلله رب العالمین﴾ سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔ ﴿الرحمن الرحیم﴾ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ (مالک یوم الدین) جو مالک ہیں روز جزاء کے۔ ﴿ایاک نعبد و ایاک نستعین﴾ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ ﴿اھدنا الصراط المستقیم﴾ بتا دیجئے ہم کو رستہ سیدھا۔ ﴿صراط الذین أنعمت علیھم﴾ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام کیا ﴿غیر المغضوب علیھم﴾ نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر غضب کیا گیا۔ ﴿ولاالضالین﴾ اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہوگئے۔

۵۔ بیسویں صدی عیسوی میں قرآن حکیم کے بے شمار تراجم منصۂ شہود پر آئے ہیں جن کی زبان، اپنی ساخت، الفاظ کی معنویت اور وسعت ادائیگی میں تقریباً سبھی حضرات میں یکسانی ہے۔ ان تراجم میں فرق، قرآن فہمی، عقائد و مذاہب کی بوقلمونی اور اغراض و مقاصد کے سبب سے ہے۔ یہ جملہ تراجم ایک وسیع محاکمہ کے طالب ہیں، جس کے لیے الگ قلم اٹھایا جا سکتا ہے۔

خاتمہ

اردو تراجم کے اس عرصہ کو جو دسویں سے چودھویں صدی ہجری تک پھیلا ہوا ہے۔ تراجم کی واضح خصوصیات، زبان کی قدرت اور سلاست و روانی کی بدولت تین بڑے عہدوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- قدیم تراجم، جو شروع سے لے کر ۱۲۰۴ھ تک یعنی شاہ عبدالقادر کے ترجمہ تک۔
  دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ خاندان شاہ ولی اللہ سے قبل تک۔
- دوسرا عہد شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے شروع ہوکر ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ تک، یعنی چودھویں صدی ہجری کے ابتداء تک۔
- تیسرا عہد چودھویں صدی سے شروع ہوکر آج تک محیط ہے۔

ہر عہد کی زبان، طرز ترجمہ، قرآن فہمی اور قدرت زبان کے انداز الگ الگ ہیں، جنہیں تراجم کے نمونوں سے واضح کرنے کی اوپر سعی کی گئی ہے۔

قرآن کریم کا اردو میں ترجمہ کرنے میں ابتدائی عہد میں قرآن فہمی کی کئی کمزوریوں کے علاوہ زبان اردو کی کم مائیگی، اس کی ابتدائی ناپختہ صورت اور کم ادائیگی بھی تھی۔ یہ

صورتِ حال انیسویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس کے بعد بیسویں صدی عیسوی میں زبان کافی حد تک صاف، درست، سلیس ادائیگی مفہوم میں پختہ اور قادر نظر آتی ہے۔ جس میں دیگر اسباب کے علاوہ بحیث الجموع علم کے افق بڑھے ہیں بلکہ اب تو نئے نئے علوم پیدا ہوئے ہیں جن کی بدولت قرآن فہمی میں نئے علوم کی تلاش اور فنون و معارف کی وسعت پر توجہ دی گئی ہے۔

ترجمہ کو قرآن کریم کے ساتھ لکھنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ بھی تدریجی مراحل سے گزرا ہے۔ ابتداء میں یہ ترجمہ ایک آیت تحریر کر کے اس پر بعد میں لکھا گیا، پھر دوسری آیت لکھی، اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اسی طرح پوری سورہ لکھی گئی۔ انہی عبارتوں کے درمیان میں اگر کسی لفظ یا جملے کی مزید توضیح کی ضرورت محسوس کی گئی تو اسی عبارت میں ''یعنی'' لکھ کر یا اس کے بغیر ہی وہ توضیح تحریر کر دی گئی، یا پھر کبھی ایسا بھی کیا گیا کہ بین القوسین وہ اضافی کلمات درج کر دیے گئے۔

یہ انداز ترجمہ قدیم اردو کے تراجم میں اکثر نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ایک دور آیا، جو ڈپٹی نذیر احمد کے دور کے لگ بھگ ہے کہ قرآن کریم کی سطور کے مابین ترجمہ تحریر کیا جانے لگا۔ جس میں ترجمہ کے کلمات کی تقدیم و تاخیر نے کافی الجھنیں پیدا کیں، تاہم آیات قرآنی کے بالکل متصل ہونے کی بدولت ان سے چنداں گریز نہ ہو سکی۔

چودھویں صدی ہجری سے ایک نیا انداز اختیار کیا گیا جو ابھی تک مروج ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیات قرآنی اوپر لکھ کر ان کے نیچے ان کا ترجمہ اور آخر میں ان تشریح یا تفسیر لکھی گئی۔ ان آیات قرآنی میں حتی الوسع کوشش کی گئی کہ وہ کسی خاص مقصد کو پوری کرتی ہوں یا ان سے کوئی خاص مضمون ادا ہوتا ہو۔

اس انداز کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' میں اور مولانا ابوالاعلی مودودی نے تفہیم القرآن میں اختیار کیا ہے۔ ان کے تتبع میں اس صدی کے دیگر مفسرین بھی اسی انداز کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ بحوالہ: قرآن مجید کی تفسیریں۔ چودہ سو برس میں (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء) ص ۳۹۰

۲۔ ایضاً، ص ۳۹۲

۳۔ ایضاً

۴۔ شیخ خوب محمد چشتی نے کہا ہے: عرب عجم مل ایک سنگھات جیون میری بولی منہ بات

یہ شعر ان کی معروف تالیف ''خوب ترنگ'' میں ہے، جو ۹۷۹ھ میں لکھی گئی۔ دیکھیے قدیم اردو، (تالیف مولوی عبدالحق، مطبوعہ کراچی: کل پاکستان انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۱ء) ص ۶۸-۶۹

۵۔ قدیم اردو، ص ۱۲۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۷۔ ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۳

۸۔ ایضاً ص ۱۲۴-۱۲۵

۹۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، (تألیف سید حمید شطاری، مطبوعہ حیدر آباد دکن: ایچ، ای، ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ، ۱۹۸۲ء) ص ۴۶

۱۰۔ قدیم اردو، ص ۱۲۷

۱۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۶۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۱-۷۲

۱۳۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد دکن (کتب خانہ آصفیہ) کے اردو مخطوطات از نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد دکن: اعجاز مشین پریس، ۱۹۶۱ء، جلد دوم، ص ۲۶، مخطوطہ نمبر ۲۴۷

۱۴۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۸۹-۸۵

۱۵۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ، مخطوطہ نمبر ۲۵۸

۱۶۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۹۲-۹۳

۱۷۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۴۵

۱۸۔ سب سے قدیم طباعت ۱۲۵۱ھ کی ہے۔

۱۹۔ قدیم اردو، ص ۱۳۰-۱۳۱

۲۰۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۰۷-۱۰۸

۲۱۔ کتب خانہ سالار جنگ (حیدر آباد دکن) اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔

۲۲۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ۔ ص ۱۲۶-۱۲۷

۲۳۔ دیباچہ فتح الرحمٰن، دیکھیے خدا بخش لائبریری، جرنل نمبر۱۱۵، ص ۲۱

۲۴۔ المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ، دیکھیے خدا بخش لائبریری جرنل نمبر۱۱۵، ص ۱۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۷۔ دلی میں یہ مدرسہ شاہ ولی اللہ کے پدر بزرگوار شاہ عبدالرحیم کا قائم کردہ تھا۔ یہی مدرسہ تھا جس کی آغوش میں شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، شاہ اسماعیل، شاہ اسحٰق، شاہ عبدالقادر وغیرہ پل کر جوان ہوئے اور باری باری اس کے مسند درس پر متمکن ہوئے۔ یہی وہ سرچشمۂ فیض ہے جہاں سے حدیث نبوی کے برکات تمام گوشہ ہائے ہند میں پھیلے (ہندوستان کی قدیم درسگاہیں:۲۵)

۲۸۔ محاسن موضح قرآن، (تالیف اخلاق حسین قاسمی، مطبوعہ دہلی: ادارۂ رحمتِ عالم شیخ چاند، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۶

۲۹۔ قدیم اردو، ص ۱۳۱-۱۳۲

۳۰ جائزہ تراجم قرآنی، (از محمد سالم قاسمی وغیرہ، مطبوعہ دیوبند: مجلس معارف القرآن، ۱۹۶۸ء)، ص ۲۲-۲۳۔ قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں، ص ۲۵۰

۳۱۔ قدیم اردو، ص ۱۳۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۴-۱۳۵

۳۳۔ یہ نسخہ اشیاٹک سوسائٹی آف کلکتہ کے کتب خانے میں موجود ہے، جس کی ایک نقل کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد دکن میں مخطوطہ نمبر ۵۲۷ پر بھی رکھی ہے۔ بدقسمتی سے یہ ترجمہ آج تک چھپ نہیں سکا، یا اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا۔

۳۴۔ قدیم اردو ص ۱۴۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۳۷، خالی جگہ پر چند لفظ پڑھے نہ جا سکے۔

۳۶۔ قرآن کریم کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۲۰۹

۳۷۔ قدیم اردو، ص

۳۸۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۳۸۲-۳۸۳

۳۹۔ ایضاً، ص ۳۷۶

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۰۶

۴۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم مع مختصر تاریخ القرآن و تراجم القرآن، (از جمیل نقوی، مطبوعہ کراچی: ادب نما، ت-د)، ص ۴۵، Oriental and India office collection, British-Libraries. London.

۴۲۔ تفسیر القرآن وھو الھدی والفرقان، ص ۹ (مطبوعہ پٹنہ: خدابخش لائبریری، ۱۹۹۵ء)

۴۳۔ تفسیر حقانی، از مولوی ابو محمد عبدالحق، جلد اول: سورۂ فاتحہ۔

۴۴۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۴۷۱-۴۷۲

۴۵۔ عبداللہ چھپروی: رفع الغواشی عن وجوہ الترجمہ والحواشی۔ کلکتہ: مطبع ہادی المطابع، ۱۳۱۹ھ

۴۶۔ قرآن حکیم کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۲۹۰

☆☆☆☆